صاحبزادہ سیّد خورشید احمد گیلانی

بنیاد پرستی ——— اعزاز یا الزام ؟

گزشتہ کچھ عرصے سے امریکی اور یورپی ذرائع ابلاغ اُن گروہوں یا افراد کو (جو اسلام کو ایک مکمل، جامع اور انقلابی "نظام حیات" کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں) ایک خاص اصطلاح سے یاد کر رہے ہیں اور وہ ہے "فنڈا منٹلسٹ" کی اصطلاح، جسے ہمارے اخبارات وجرائد "بنیاد پرست" لکھ رہے ہیں، جسے یورپ تو کم ازکم ہمارے حق میں ایک گالی سمجھتا ہے لیکن ہمارے اخبارات وجرائد اور بعض نام نہاد روشن خیال دانشور اور رہنما اسے اپنے اوپر ایک الزام ضرور قرار دیتے ہیں اور اس کی تردید میں قولاً اور عملاً یہ باور کراتے ہیں کہ ہم "بنیاد پرست" نہیں بلکہ سیدھے سادے مسلمان ہیں حتیٰ کہ وزیر اعظم تک اس سے برأت کا اظہار واعلان کرتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو "بنیاد پرست" کہہ کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ یہ لوگ ذہنی طور پر ازمنہ وسطیٰ کے رہنے والے، تاریک خیال، سائنس دشمن، حریفانِ علم و دانش، ترقی کے مخالف، رجعت پسند، روایت پرست اور قدامت نواز ہیں، جنہیں دورِ حاضر کے نت نئے بدلتے حالات کا ادراک، اور تہہ در تہہ معاملات کا شعور حاصل نہیں۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے جب بعض اسلامی ممالک میں انقلابی تحریک زوروں پر تھی، اور لیبیا سر اُبھار رہا تھا اور اُدھر فلسطین کی تحریکِ مزاحمت نئی کروٹ لے رہی تھی تو اس وقت امریکی اور یورپی ذرائع ابلاغ مسلمانوں کے لیے MILITANT (جنگجو) کی اصطلاح استعمال کرتے تھے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی قوم ملوکیت اور شاہی استبداد کے خلاف اُٹھ کھڑی ہو، کوئی کمزور ملک اگر امریکہ کے مقابلے میں سر اُٹھاتا دکھائی دے اور لوگ اپنی سرزمین پر ناجائز قبضے کے خلاف مزاحمت کریں تو وہ فوراً جنگجو بن جاتے ہیں، اگر اصطلاحات کے استعمال کا یہ عالم رہا تو نجانے جمہوریت، حق خود ارادیت اور آزادی و استقلال کے کیا معنی رہ جائیں گے؟ یعنی دنیا اگر اپنے اوپر ملوکیت کو مسلط کیے رکھے یا کم ازکم برداشت کیے رکھے، اپنے حق خود ارادی سے دستبردار ہو جائے، غیروں کی دست نگر بنی رہے، ایک یا دو بڑی طاقتوں کی حاشیہ بردار رہے، اپنی آزادی اور استقلال سے ناآشنا رہے اور ہمیشہ سیاسی اور اقتصادی غلامی کا جوا اپنے گلے میں ڈالے رکھے تو وہ روشن خیال، ترقی پسند اور ماڈرن کہلانے کی مستحق ہے اگر وہ اپنے حقوق سے دستبرداری اور اپنی آزادی و خود مختاری سے دستکشی کا اعلان کر دے تو وہ فوراً "جنگجو اور

بنیاد پرست" بن جاتی ہے گویا دوسرے لفظوں میں امریکی بالادستی کو قبول کیے رکھنا اور افرنگی تہذیب و معاشرت کا اسیر بنا رہنا "روشن خیالی" اور اس کے مقابلہ میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری اور اطاعت کا اظہار کرنا شعائر اسلامی کا اختیار کرنا اور اسلام کو رہنمائی کا سرچشمہ قرار دینا "بنیاد پرستی" ہے ۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اور ہمارے (نام نہاد) لیڈر تہذیبی اور ذہنی طور پر مغرب اور امریکہ سے اس قدر مرعوب ہیں کہ ہماری زندگی کا بیشتر حصہ صرف اس تگ ودو میں صرف ہو جاتا ہے کہ ہم علمی و فکری اور عملی و اخلاقی طور پر اس طرح نظر آئیں جیسا کہ مغرب اور امریکہ چاہتا ہے اور ایسا نظر آنے کے لیے اپنی شکل و صورت نشست و برخاست اطوار و عادات اور کردار اور اخلاق سے لے کر اسلام تک کا حلیہ بگاڑنے پر آمادہ و مستعد رہتے ہیں جیسے وہ اسلام کہیں ہم ویسا اسلام پیش کرنے میں لگ جاتے ہیں ۔ جیسے وہ آدابِ زندگی بتائیں ہم فوراً انہیں اختیار کر لیتے ہیں، جس طرح کی تہذیب کو وہ پسند کریں ہم اُس طرح کے مہذب بنتے ہیں اپنی توانائیاں صرف کر دیتے ہیں جو مسلمان اُن کو درکار ہے ہم ویسے مسلمان بن جاتے ہیں حالانکہ اسلام اور مسلمانی میں امریکہ اور مغرب کی رضا نہیں بلکہ خدا اور رسول کی رضا مطلوب ہوتی ہے تب جا کر کوئی شخص مسلمان بنتا ہے، تہذیب وہ نہیں جو امریکہ اور یورپ سکھاتے ہیں بلکہ ہمارا معیارِ تہذیب اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونا چاہیئے، کیونکہ انہی کے دین اور انہی کے نام کی نسبت سے ہمارا ملی تشخص قائم ہے ورنہ رنگ، نسل، علاقہ اور زبان کسی کو مسلمان یا کافر نہیں بناتے، اس اعتبار سے انسانیت میں کوئی جوہری فرق واقع نہیں ہوتا کیونکہ سبھی اولادِ آدم ہیں ۔

۷۰ء کے عشرے میں پاکستان کے اندر "دایاں بازو" اور "بایاں بازو" کی اصطلاح کا خوب چرچا رہا ۔ مغرب کی نظر میں "دایاں بازو" کا معنی تاریک خیال اور تنگ ذہن اور "بایاں بازو" کا مطلب روشن خیال اور ترقی پسند تھا ۔ ہمارے لیڈر بڑے مخمصے اور عجلت میں نظر آتے تھے کہ وہ خود کو ہر جگہ "بایاں بازو" ثابت کریں حالانکہ قرآن مجید میں واضح طور پر "اصحاب الیمین" اہل جنت اور "اصحاب الشمال" اہل جہنم قرار دیئے گئے ہیں قرآن مجید کی روشنی میں "دایاں بازو" اور "بایاں بازو" کا مفہوم بالکل صاف تھا اور ہمیں بڑے فخر کے ساتھ خود کو "دایاں بازو" کہلانا چاہیے تھا لیکن بُرا ہو مرعوب ذہنیت اور غلام سوچ کا، جس نے ہماری آنکھیں چُندھیا رکھی ہیں ہم نے فوراً یورپ کے بیان کردہ مفہوم کو قرآن مجید کے واضح کردہ مفہوم پر ترجیح دے دی اور "دایاں بازو" کہلانے میں شرماتے اور جھجکتے رہے ۔ ہماری لیڈر شپ کو فکر لاحق ہو گئی کہ قرآن مجید کس گروہ کو "اصحاب الشمال" (بایاں بازو) قرار دیتا ہے اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے بلکہ مغرب کے نزدیک "بایاں بازو" کا جو مفہوم ہے اس کے مطابق روشن خیال اور لبرل بننا ہے اگر ہم نے دیر کر دی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اہلِ مغرب کی لغت میں تاریک خیال اور قدامت پسند ٹھہرا دیئے جائیں، یہی وہ احساسِ کمتری ہے جو ہمیں خدا اور رسول سے بھی دور

لے گیا ہے اور وصال صنم سے بھی ابھی تک محروم چلے آرہے ہیں۔ مسلمان بننے کی تو ہم نے خاص جدوجہد نہیں کی۔ لیکن یورپ نے بھی ابھی تک ہمیں صحیح معنوں میں ماڈرن، لبرل، پروگریسو اور لیفٹسٹ کا سرٹیفکیٹ عطا نہیں کیا اور اس طرح ہم درمیان میں معلق ہو کر رہ گئے ہیں اگر ہم اتنی کاوش مسلمان بننے کی کرتے تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس عرصے میں ہمیں یقیناً "مومنِ خالص" کا لقب عطا کر چکے ہوتے۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض دانشور کہتے نظر آتے ہیں کہ آخر ان اصطلاحات میں کیا رکھا ہے؟ اگر ہم خود کو دایاں بازو یا بنیاد پرست نہ کہلائیں اور یورپ کی مرضی کے مطابق ان "تہمتوں" سے برأت کا اظہار کر دیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ نرم سے نرم الفاظ میں خود فریبی یا کم از کم سادہ لوحی ہے، ہم محض لفظوں کی الٹ پھیر کو دیکھ رہے ہیں اور ان کے نفسیاتی پس منظر سے صرفِ نظر کر رہے ہیں بات صرف الفاظ اور اصطلاحات کی نہیں، ہر لفظ کا ایک مخصوص مفہوم اور ہر اصطلاح کا ایک نفسیاتی پس منظر ہوتا ہے۔ الفاظ اور اصطلاحات باقاعدہ علامات کا درجہ رکھتے ہیں اور یہی علامات کسی سوسائٹی یا فرد کے بارے میں رائے قائم کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں، لفظوں کا فقط لغوی معنی اور اصطلاحات کا فقط سطحی مفہوم نہیں ہوتا اگر ایسا ہو تو پھر سارے تشخصات ختم ہو کر رہ جائیں، نہ دعا کا مفہوم باقی رہے اور نہ گالی کا کوئی مطلب کیونکہ دونوں چیزیں حروفِ تہجی سے مرکب ہوتی ہیں تو کوئی دعا دے یا گالی، اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ — اصطلاحات کی اپنی قدر و قیمت ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یورپ کیوں ہر چوتھے روز مسلمانوں کے لیے ایک نئی اصطلاح اختراع کرتا!

مسجد کا ایک اپنا ڈیزائن ہوتا ہے اور گرجا اور مندر کا اپنا نقشہ، حالانکہ سبھی اینٹ پتھر سے بنے ہوتے ہیں لیکن ہر شخص مخصوص ڈیزائن سے پہچان لے گا کہ ان میں مسجد کون سی ہے، اور گرجا اور مندر کون سا؟ کون سی جگہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے اور کون سی عیسائیوں اور ہندوؤں کی، اگر ہم ان علامات اور تشخصات، اسماء اور اصطلاحات کے بارے میں یہ رویہ اپنا لیں کہ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے" تو میرے خیال میں ہر بات پہیلی بن جائے گی، پھر نہ کوئی مسلمان رہے گا اور نہ کوئی کافر۔

سوشلزم یا کمیونزم اور اسی طرح ڈیماکریسی، یہ بظاہر اصطلاحات ہیں ان کے لغوی معنی لیے جائیں تو ان اصطلاحات میں کیا خوبی ہے؟ لیکن یہ محض الفاظ نہیں اور فقط اصطلاحات نہیں بلکہ ان کی پشت پر باقاعدہ ایک فلسفہ اور ایک نظام کارفرما ہے۔ جو انہیں آپس میں ممتاز اور منفرد کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض نام بعض قوموں کے ساتھ مختص ہو کر رہ گئے ہیں اور بعض علامات بعض تہذیبوں کی شناخت بن کر رہ گئی ہیں، مثلاً ہندی میں "کرپارام" جو ایک نام ہے اس کا ٹھیک مترادف عربی میں "عطاء اللہ"

ہے لیکن کوئی مسلمان اپنا نام "کرپارام" نہیں رکھتا آخر کیوں؟ جب کہ معنی اور مفہوم میں بال برابر فرق نہیں صرف، دو زبانوں کے اپنے لب ولہجے اور ساخت کا فرق ہے یہ اس لیے ممکن نہیں کہ انسانی دنیا میں، جب لفظ، اصطلاح القاب، خطابات وغیرہ وارد ہوتے ہیں تو وہ فقط بے جان الفاظ و حروف نہیں رہ جاتے بلکہ ان کے ساتھ کچھ جذبات اور دوسرے تشخصات وابستہ ہو جاتے ہیں اگر ان میں سادہ لوحی سے ذرا بھی ادل بدل کیا جائے تو سارے کے سارے جذبات اور تشخصات مجروح اور مسخ ہو کر رہ جاتے ہیں اور کسی بھی سوسائٹی کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہر اصطلاح کو بہت ہلکا پھلکا اور لفظی گورکھ دھندا سمجھنے کا رجحان پیدا ہو جائے تو پورا انسانی نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے، سو ہمیں ہر اُس اصطلاح کو اپنے سینے سے لگانا چاہیئے جو خواہ مغرب کی نظر میں کتنی معیوب اور معتوب کیوں نہ ہو لیکن فی الواقع وہ محمود اور مستحسن ہو جیسا کہ "بنیاد پرست" یہ اصطلاح کیوں محمود اور مستحسن ہے؟ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یورپ نے اسے ہمارے ساتھ چپکا دیا ہے ظاہر ہے اس میں کوئی خوبی ہے جسے وہ بگاڑ کر ہمارے نام کا لاحقہ اور سابقہ بنا رہا ہے، اور اس کے نزدیک وہ مسلمان "بنیاد پرست" ہیں جن کی فکر کا قبلہ احکام الٰہی اور سوزح کا کعبہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جو شعائر اسلامی کے پابند اور کبائر سے مجتنب ہیں، جو سرمایہ داری اور اشتراکیت پر تین حرف بھیجتے اور اسلام کو اپنا ملکی نظام حیات سمجھتے ہیں۔ یورپ ان (نام نہاد) مسلمانوں کو قطعاً "بنیاد پرست" نہیں کہتا اور سمجھتا جو ہر آئے روز اسلام میں کسی نہ کسی نظام کی پیوندکاری کرتے رہتے ہیں، جن کی بود و باش میں اسلام کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی جن کے ذہن اور فکر پر ہر چیز کا غلبہ ہے بجز اسلام کے!

اور دوسری وجہ اس اصطلاح کو ڈنکے کی چوٹ اختیار کرنے کی یہ ہے کہ دنیا کا کوئی دین اور نظام بنیاد کے بغیر فروع پر قائم نہیں، سیاسیات ہی دین اور نظام کی اصل ہوتی ہیں۔ فروعات تو اس کے برگ و ثمر ہوتے ہیں، اس اعتبار سے ہم "بنیاد پرست" ہیں کہ ہم اسلام کے اساسی عقائد کو مان کر مسلمان بنے ہیں توحید، رسالت، وحی آخرت وغیرہ ہماری بنیاد ہیں جن پر ہم اپنا نظامِ حیات استوار کرنا چاہتے ہیں اور اس پر ہمیں فخر ہے کہ ہمارا نظریۂ حیات اس کائنات کے خالق و مالک اور اس کے معصوم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حمایت یافتہ ہے اور اس کے اساسی اصول ایک ایسی کتاب میں درج ہیں جس کی صحت اور تاریخی حیثیت کو چودہ سو سال میں دنیا کا کوئی مفکر چیلنج نہیں کر سکا، اور ہمارے لیے نظام کا ماڈل وہ عہدِ حکومت جسے اس زمین کے انتہائی برگزیدہ اور راستباز انسانوں نے قائم کیا، ان معنوں میں ہم بنیاد پرست ہیں اور یہ کوئی معیوب لقب نہیں جو ہم اپنے لیے پسند نہ کریں۔

جو لوگ روشن خیالی اور وسعتِ نظری کی آڑ میں "بنیاد پرست" کہلانے سے عاری ہیں غالباً ان کے خیال میں اپنا راستہ کھلا رکھنا ہے کہ وہ جب چاہیں اسلام کے بجائے کسی اور نظام کو اپنا نظریۂ حیات بنا لیں، سنتِ رسول

ابلہ میں اپنی شریعت وضع کریں اور اطاعتِ خدا و رسولؐ کی جگہ اپنے نفس اور خواہشات نفس کی پیروی کر لیں
پھر بھی مسلمان کہلائیں۔

دین کو کھلی چراگاہ قرار دینے کا آج نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ جو چاہتا ہے اس میں منہ مارتا ہے اور
اقتدار، مفادات، خواہشات اور اشغال کو دین کا نام دے دیتا ہے۔ ترکِ نماز، شراب نوشی، زراندوزی، تضحیک
ر، آمریت اور عیش کوشی سب کے ہوتے ہوئے وہ خود کو مسلمان کہلانے پر اصرار کرتا ہے اور اپنا حق گردانتا
کوئی فقیہ اور ملاّ مجھے اسلام اور مسلم سوسائٹی سے خارج نہیں کر سکتا اور دین کے معاملے میں ہماری مداہنت کا
ب ہمیں واقعی اس نقطے پر لے گیا ہے کہ کھلے عام اسلامی نظامِ حیات کو چیلنج کرنے والا اور اسلامی شعائر
ت کا مذاق اڑانے والا، سود کے نظام کی مدافعت کرنے والا، رقص و سرود کو عین اسلامی قرار دینے والا اور
ب و نہب کو جائز سمجھنے والا بھی ہماری نظر میں مسلمان بلکہ "مسلمان رہنما" رہتا ہے۔

اگر ہم "بنیاد پرست" ہوتے تو کوئی شخص لاکھ چلمن کی اوٹ لیتا لیکن ہم اس کا چہرہ فوراً پہچان جاتے کہ یہ
سا سے ہے ہمارا خیر خواہ ہے یا استعمار کا ایجنٹ ہے اور خدا و رسولؐ کا باغی ہے۔

ہم خود کو لسی کی طرح پتلا کرتے کرتے اپنا ذائقہ اور رنگ تک گنوا بیٹھے ہیں اور کوئی ایک علامت ایسی نہیں
دی جس سے "اسلامی قیادت" کے خدوخال واضح ہوتے اور ہمارا ذہنی و اعتقادی استحصال نہ ہو سکتا،
ے رہنما کھلم کھلا اسلام کے مزاج کے خلاف قومیت اور نسلیت پرست بھی ہیں اور مسلمان بھی، استعمار کے مفادات
فظ بھی ہیں اور مسلمان بھی، اسلام دشمن طاقتوں کے حلیف بلکہ آلۂ کار بھی ہیں اور مسلمان بھی، یہ سب اسی "روشن
" کا کیا دھرا ہے جو یورپ نے ہمیں عطا کی ہے کہ لفظ تو لفظ انسان اپنا اعتبار کھو بیٹھے ہیں۔ ہم اپنے اور
ئے، کھرے اور کھوٹے، سچے اور جھوٹے، دوست اور دشمن، محافظ اور معاند اور خیر خواہ اور بدخواہ کے
یان تمیز کرنے سے عاری ہو گئے ہیں، اور ہر شخص "روشن خیالی" کے زیر پردہ سب کچھ بننے اور کہلوانے کا
محفوظ کیے بیٹھا ہے جو اصل میں کچھ بھی نہیں صرف بندۂ ہوا و ہوس ہے، تن پرور اور نفس پرست ہے، اصول
ن اور انسانیت کُش ہے۔

"بنیاد پرست" کہلانے میں آخر کیا حرج ہے؟ اگر اس سے مراد اور مطلوب ایک راسخ الاعتقاد اور اصول
ے کر فروع تک اسلام کا پابند مسلمان ہوتا ہے اس اصطلاح سے بدکنا یہ باور کرانا ہے کہ گویا ہم اسلام کے
ر میں اس طرح رہیں کہ اس میں ہر طرف چور دروازے ہوں جب اور جہاں سے چاہیں، جھانک بھی لیں اور
لانگ بھی لگا لیں اور پھر واپس آ کر ویسے کے ویسے مسلمان بن جائیں، قرآنِ مجید نے یقیناً ایسی ہی نفسیات
ھنے والے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ "یؤمنون ببعض ویکفرون ببعض" (دل پسند چیزوں کا اقرار اور

مزاج کے خلاف چیزوں کا انکار) ایسا رویہ یورپ کی نظر میں معیوب نہ ہو تو الگ بات ہے اسلام اسے انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ جب میرا اقرار و انکار جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ طیب خاطر سے ہے تو پھر کوئی اصول قبول کر لینے کے بعد اس سے ہیر پھیر اور انحراف اور گریز چہ معنی وارد؟ اگر ماننا ہے تو کھلے دل سے مانو اور حدود کا احترام کرو، اگر نہیں ماننا تو راستہ کھلا ہے دنیا میں کوئی نہیں پوچھے گا البتہ آخرت میں جوابدہی کا خود اہتمام کر لو اور اپنا جواز ڈھونڈ لو لیکن ہماری نفسیات اس طرح بن چکی ہیں کہ ہم مستقل طور پر "نیمے دروں نیمے بروں" رہنا چاہتے ہیں۔ اگر اسلام کا نام لے کر فائدہ پہنچتا ہے تو ہم مسلمان ہیں اور اگر ہمارے مفاد، مزاج اور اقتدار پر کوئی زد پڑتی ہے تو پھر گریز اور انحراف کی ہزار راہیں کھلی رکھنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلے میں مولانا روم نے مثنوی میں ایک تمثیل کے ذریعے ایسی نفسیات کو واضح کیا ہے جو امید ہے زیر نظر مضمون کے سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ مولانا روم لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی کلائی پر شیر گدوانے کے لیے گیا جب جراح نے پہلی سوئی چبھوئی تو اسے تکلیف ہوئی اور کہنے لگا یہ کیا بن رہا ہے؟ جراح نے کہا کہ شیر کے کان بنا رہا ہوں تو اس نے کہا کان رہنے دو، کان کٹے شیر بھی تو ہوتے ہیں، جراح نے آنکھ بنانی چاہی تو اس نے کہا کہ ایک آنکھ رہنے دو، شیر کانا ہو تو کیا فرق پڑتا ہے، تیسری چبھن پر پوچھا اب کیا بن رہا ہے جراح بولا شیر کے پاؤں بنا رہا ہوں۔ اس نے کہا ایک ٹانگ رہنے دو، لنگڑا شیر ہی بنا دو الغرض ہر چبھن اور ٹیس پر وہ شیر کا ایک ایک عضو ختم کرواتا گیا۔ بالآخر جراح نے کہا کہ ایسا شیر مجھ سے نہیں بن سکتا جس کی نہ آنکھ ہو نہ کان، نہ ٹانگ اور نہ دُم اگر ایسے ہی شیر بنوانے کا شوق ہے تو کسی اور سے بنوا لو۔

اسی تمثیل کے مطابق ہمارا "روشن خیال" مسلمان، دائرہ اسلام میں رہنا چاہتا ہے کہ نماز نہ پڑھی تو کیا ہم مسلمان نہیں رہیں گے؟ شراب، جوا، ڈانس، سود، بے حجابی ایسے مشاغل اختیار کر لیے تو کیا ہم دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے؟ اگر تہذیب مغرب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تو اسلام پر کیا حرف آ جائے گا۔؟

اگر سیاسی نظام مغرب سے معاشی نظام اشتراکیت سے، قانونی نظام فرانس سے لے لیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟

علیٰ ہذا القیاس اسلام کے اصولوں سے لے کر اس کی ہر ہر شق سے پہلو تہی بھی ہم کرنا چاہتے ہیں اور برابر مسلمان بھی رہنا چاہتے ہیں، یہ رویہ سراسر کٹ حجتی پر مبنی ہے جسے ایمان و دانش کی بارگاہ میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

برصغیر میں انگریزی نظام تعلیم کے بانی لارڈ میکالے نے اپنے مقصدِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے ذریعے ہمیں "جسم مشرقی مگر روح مغربی درکار ہے"، یعنی اس میکدۂ تعلیم میں خُم لنڈھانے

والے بے شک نسلی مسلمان رہیں، نام ان کے مسلمانوں جیسے ہوں، لباس وہ اسلامی طرز کا پہنیں، شادی بیاہ اور نکاح طلاق شرعی طریقے سے کریں لیکن ان کی سوچ، دماغ، قلب اور روح مغرب کے رنگ میں رنگی ہو، تاکہ فکری بالادستی یورپ کی برقرار رہے۔ اب لارڈ میکالے کو کون جاکر قبر میں بتائے کہ آپ کو تو ہم سے صرف روح مغربی درکار تھی اور جسم کے مشرقی ہوتے پر آپ کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا، مگر ہم اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ روح تو مغرب کی ہے ہی ہم نے اپنا قالب اور چولا بھی مغربی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، رسم ورواج، بولی ٹھولی، گھر کا ماحول، آدابِ محفل، خلوت وجلوت کے اطوار، لباس کی تراش خراش اور لب ولہجہ تک ہم نے فرنگی بنا ڈالا، فقط رنگ بدلنے کی کمی رہ گئی ہے۔ اگر بس میں ہو تو یہ بھی کر ڈالیں۔

ہمارے ہاں ایک بڑے اور مؤثر طبقے کی (جو سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے بالادست طبقہ ہے) یہ ذہنیت کیوں بن گئی ہے کہ وہ یورپ کے اعزاز کو اعزاز اور اس کے الزام کو الزام سمجھتا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ وہ سطحیت پسندی، اتھلاپن اور اعتماد کا فقدان ہے جو کسی فرد یا قوم میں مناسب تربیت کی کمی اور اپنی اصل اور جڑ سے پیوستگی میں نقص کے باعث پیدا ہوجاتا ہے، جس طرح کوئی درخت خواہ کتنا بے ڈول ہو مگر اس کی جڑ بہت گہری اور تنا مضبوط ہو تو معمولی ہوا تو کیا جھکڑ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اس کے مقابلے میں بڑا نرم و نازک، خوشنما، تراشیدہ خراشیدہ درخت تیز ہوا کے ایک جھونکے کی مار برداشت نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ قومیں جو محض فیشن، نمائش اور تکلفات کی دلدادہ اور عادی بن جائیں اور اپنی تہذیب، ثقافت، اپنے ورثے اپنی تاریخ اور اپنے دینی رشتوں کو یکسر فراموش کر بیٹھیں وہ پراپیگنڈے کی معمولی ضرب اور ترغیب کی برائے نام جھلک سے نیم جان ہوجاتی ہیں اور ذہنی وروحانی امراض کا ایک لشکر ان کا گھیراؤ کرلیتا ہے انہی بیماریوں میں ایک اعتماد کے فقدان کی بیماری ہے جو قوم کو حوصلہ مند اور جری بنانے کے بجائے موم کی گڑیا بنا دیتی ہے جس کا ناک ہر چوتھے روز بدلتا رہتا ہے۔

اعتماد ہی وہ جوہر ہے جو فرد اور قوم کو اندازِ خسروانہ، عطا کردیتا ہے، آدابِ خود آگاہی آجائیں تو غلاموں پر بھی اسرارِ شہنشائی کھلتے چلے جاتے ہیں۔

مور اپنی تمام تر خوبصورتی اور رعنائی کے باوجود اپنے پاؤں دیکھ کر شرما سا جاتا ہے، اس کا یہ رویہ اس کے اعتماد کو ہر روز مجروح کرتا ہے اس طرح ہم مسلمان شاندار ماضی، پرشکوہ تہذیب، قابلِ فخر روحانی ورثہ، رشک آمیز علمی پس منظر اور گرانقدر دماغی اور فنی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود ایک ذرا سا رنگ کا میلا ہونا یا انگریزی میں کمزور ہونا ہمیں مور کی طرح اپنے پاؤں دیکھنے پر اُکسا دیتا ہے اور ہم شرمانے لگ جاتے ہیں، اگر آنکھوں

میں بقول حکیم الامت علامہ اقبال۔ خاکِ مدینہ کا سُرمہ ہو تو جلوۂ دانشِ فرنگ سے خیرہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا، انسان کے ہر اقدام کا دارومدار اس کے فکری محور پر ہوتا ہے، مثلاً ایک مسلمان کی سوچ کا تانا بانا اسلام سے بنا ہوا ہوتا ہے، اس کا وفاداری اور اطاعت کا مرکز خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہوتی ہے، اس کے نزدیک ایک فقط عالمِ دنیا ہی تمام امور و معاملات کا منتہا نہیں بلکہ یہ سلسلہ آخرت تک چلتا ہے، اس کے عقیدے کے مطابق خوشنودی محض انسانوں کی مطلوب نہیں بلکہ رضائے الٰہی، ہر چیز پر مقدم ہے اس کے ہاں کسی عمل کی تصویب بلاتردید قرآن و سنت سے مشروط ہے الغرض اس طرح کی دوسری چیزیں جو ایک مسلمان کی فکری ساخت کو دوسرے لوگوں سے ممیز کرتی ہیں، تو لامحالہ ایک مسلمان کا معیارِ تہذیب، اصولِ خیر و شر، فلاح و خسران کے ضابطے اور عزت و ذلت کے پیمانے یقیناً" دوسروں سے مختلف ہوں گے، اگر ایسا ہوگا تو پھر کسی مسلمان کو برتر اور کمتر، بہتر اور بدتر، صحیح اور غلط اور اعزاز اور الزام کے بارے میں فیصلہ کرنے یا کسی چیز کا انتخاب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اگر فکری سمت متعین نہ ہو، وفاداری کا مرکز طے نہ ہو، دنیا اور دنیا کے پیدا کرنے والے رب کی خوشنودی میں فرق واضح نہ ہو تو مسلمانوں سے ایسے ہی لطیفے سرزد ہوتے ہیں جیسے کہ آج کل کے دور میں ہو رہے ہیں کہ ہمارے ہی بقول ہمارا ایمان تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے لیکن نظامِ سیاست اور اندازِ معیشت و معاشرت یورپ کا رائج ہونا چاہیئے یہ تضاد اس لیے ہے کہ ہم اپنا رخ متعین نہیں کر پا رہے جس کے نتیجے میں ہمارا معیار نصب العین طے نہیں ہو رہا اور اہم اور غیر اہم میں ترجیح قائم نہیں ہو رہی، اگر ہر بڑے اور چھوٹے امر میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حاکم اور فیصل مان لیں اور اپنے دین اور اپنی تہذیب کو اپنی روحانی اور فکری و عملی توانائی کا سرچشمہ قرار دے لیں تو ہمارے اندر نہ یورپ سے مرعوبیت کی بیماری رہ جائے گی اور نہ ہر بات پر معذرت خواہی کی عادت رہے گی اور ہم میں ایک طرح کا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوگا۔

اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ ہم دنیا میں رہتے ہوئے اس کے آئے دن کروٹ بدلتے حالات اور تقاضوں کے ادراک سے عاری ہو جائیں، دنیا کے لوازم سے بے خبر ہو جائیں، عالمی نشیب و فراز سے لاتعلقی کا رویہ اپنا لیں جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ نہ کریں، علوم و فنون کے ارتقاء سے بے بہرہ رہیں، دنیا کے لیے بندوبست میں خود کو شامل نہ کریں سائنسی انکشافات اور اکتشافات سے فیضیاب نہ ہوں، دنیا کی ترقی اور صنعت کی ترویج میں حصہ دار نہ بنیں اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے تہہ در تہہ واقعات اور ان کے مضمرات، اثرات اور نتائج سے بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ جائیں لیکن اپنی ناک کا چھید اتنا بھی کھلا اور ڈھیلا نہ رکھیں کہ ہندو آئے اور اپنی معاشرت کی نکیل ہماری ناک میں ڈال دیں، یورپ اپنی تہذیب کی نکیل ڈال دے، امریکہ اپنی سیاسی غلامی کی نکیل ڈال دے اور یہ سب کچھ ہم چپ کرکے برداشت کرتے رہیں۔ (باقی)